مولانا محمد علی

محررہ محمد حسن

مولانا محمد علی مولانا شوکت علی

قیمت چار آنے

ہندوستان ریویو - لاہور

Title Printed by "Star Printing Press" and Contents by The Islamia Steam Press, Lahore.

محمد علی ۱۸۷۸ء میں عدم آباد سے عالم وجود میں آئے۔ انکے والد عبد العلی خاں ریاست رامپور میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھے۔ انکے دادا علی بخش خاں نے زمانہ غدر میں انگریزوں کی قابل قدر اعانت کی تھی جس کے صلے میں انہیں اپنے وطن مالوف مراد آباد میں ایک گراں بہا جاگیر عطا ہوئی ٭

محمد علی کی والدہ آبادی بانو بیگم نواب درویش علی خاں پنج ہزاری کی اولاد میں سے ہیں جو اکبر اعظم کے دربار میں اپنی دانشمندی۔ جرات اور آزادی رائے کے لئے خاص وقعت رکھتے تھے۔ آبادی بانو ایک تعلیم یافتہ روشن خیال۔ نیک دل اور خدا پرست بیگم ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی آج مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے سیاسی رہنما سمجھے جاتے ہیں ٭

طفولیت و تعلیم

ابھی محمد علی ۲ برس کے بھی نہیں ہونے تھے۔ کہ انکے والد کا انتقال ہوگیا اور اسطرح انکی والدہ ماجدہ کے کندھوں پر کنبہ کا بارِ گراں آن پڑا۔ محمد علی کے علاوہ انکے پانچ بھائی بھی ابھی عالم طفولیت میں محافظ ہاتھوں کے طلبگار تھے۔ انکی والدہ کی عمر اس وقت صرف

ستائیس سال کی تھی۔ عام طور پر ایک ہندوستانی بیوہ بیگم کے لئے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام مشکل بلکہ محال ہوتا ہے۔ وہ انتہائی محبت کی وجہ سے بچوں پر کسی طرح کی سختی کرنا پسند نہیں کرتی۔ اور ان کی بعض مذموم حرکات سے درگذر کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے تعلیم سے محروم اور اخلاق سے معرا ہو جاتے ہیں۔ مگر آبادی بانو بیگم عام عورتوں سے الگ ایک خاص طبیعت رکھتی ہیں۔ اور وہ نہ صرف ایک گھر کے بلکہ ایک پوری سلطنت کے انتظام کی قابلیت رکھتی ہیں۔ ان میں رضیہ بیگم کا انتظام۔ چاند بی بی کی جرات اور نور جہاں کی قابلیت ہے اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ وہ رابعہ بصریہ رض کی طرح خداترس اور عبادت گذار بیگم ہیں۔ انہیں اپنے مقدس مذہب اسلام سے اسقدر عشق ہے کہ وہ اسکی عزت و ناموس کے لئے جان دینا گوارا کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کا سانس ان کا مذہب ہے۔ اور وہ اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتیں ؎

اس عاقبت اندیش بیگم کی آغوش تربیت میں محمد علی کی پرورش ہوئی۔ انکی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا اور وہ اپنی غیر معمولی ذہانت کے ساتھ حصول تعلیم میں مشغول ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم سرسید اپنی قوم کی بے جا مخالفت کا مقابلہ کر رہے تھے بعض علما کی مساعی سے یہ عام طور پر مشہور ہو گیا کہ علیگڈھ کالج کی تعلیم سے کفر و الحاد کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت کم مسلمان اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے پر رضامند تھے۔ آبادی بانو بیگم کی روشن خیالی اس سے ظاہر ہے کہ اس حالت میں بھی انہوں نے اپنے بچوں کو علیگڈھ بھیجنا مناسب سمجھا اور اپنے بعض متعصب اعزا کی کچھ پرواہ نہیں کی ؎

علیگڈھ میں محمد علی کی ذہانت کے جوہر زیادہ نمایاں ہو گئے اور وہ کالج کے ممتاز ترین طلبا میں شمار ہونے لگے۔ انکی انگریزی زباندانی۔ انکی قوت بیانیہ۔ ان کا علو تخیل انکی مضمون نگاری ان کا فلسفیانہ اجتہاد۔ اور ان کا تاریخی استشہاد کالج میں ایک نمونہ خیال کیا جاتا تھا اور وہ اپنے ہم سبقوں میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ مگر وہ کالج میں کچھ خشک علمی زندگی نہیں رکھتے تھے جیسا کہ عام طور پر اس طرح کے طلبا کا خاصہ ہے۔ بلکہ وہ اپنے شور و شغب کھیل کود اور ذہانت و شرارت کیوجہ سے بھی طلبا میں عزیز سمجھے جاتے تھے۔

بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد نواب محمد اسحاق مرحوم سابق مدار المہام ریاست رامپور و سکرٹری علیگڈھ کالج کی توجہات گرامی کی وجہ سے وہ ریاست کیطرف سے آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے کے لئے انگلستان چلے گئے۔ اور وہاں اکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ یہاں وہ چار سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور ۱۹۰۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری لینے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر انڈین سول سروس میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

جولائی ۱۹۰۲ء میں وہ واپس آئے اور فی الفور الہ آباد ہائی کورٹ کے امتحان میں شریک ہو گئے۔ اس عجلت کیوجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

ملازمت

محمد علی جب آکسفورڈ میں ہی تھے کہ ریاست بڑودہ کے مشہور و معروف کمنوی فتح سنگھ

آنجہانی بھی وہاں شریک تعلیم ہوئے۔ محمد علی کی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کنور صاحب کے لئے
جذب و کشش کا سبب ہوئی۔ اور وہ انکے گہرے دوست ہو گئے ؛
جب مسٹر محمد علی ہندوستان واپس آئے۔ تو کنور نے مہاراجہ کو ان کی غیر معمولی قابلیت
کیطرف توجہ دلائی اور خواہش ظاہر کی کہ مہاراجہ انہیں اپنی ملازمت میں لے لیں چنانچہ
مہاراجہ نے فوراً تحریک کی۔ اور مسٹر محمد علی ان کی ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے ؛
ابتداء میں انہیں محکمہ افیون کا افسر اعلےٰ بنایا گیا۔ اور انہوں نے اپنے مساعی سے
اس محکمہ کی آمدنی بائیس گنا کر دی جس پر مہاراجہ ان سے بہت خوش ہوئے ؛
اس کے بعد وہ ضلع نوساری کے کمشنر بنائے گئے۔ اور وہاں گراں قیمت پر زمین
خریدنے کے متعلق غربا پر جو ظلم کیا جاتا تھا۔ اس کا انہوں نے انسداد کیا ؛
کمشنری کے بعد وہ ولی عہد موصوف کے پرسنل اسسٹنٹ ہو گئے اور انکی نگرانی کے
فرائض انجام دیتے رہے ؛
ریاست کی ملازمت کے زمانہ میں انکے اوصاف و خصائص وہاں شہرہ آفاق ہو گئے
اور تمام ریاست میں محمد علی کی شخصیت ایک ممتاز شخصیت سمجھی جاتی تھی ؛
نواب وقار الملک مرحوم کی طرح زمانہ ملازمت میں ان کا کیرکٹر نہایت ممتاز رہا
اور ان کا دامن انصاف کبھی بھی بے جا رعایت یا عدم تدین سے آلودہ نہیں ہوا۔
ریاست کے ابتدائی ایام ہی میں ایک ٹھیکہ دینے پر ایک نہایت گرانقدر رقم بطور ہدیہ
مل رہی تھی۔ انہیں بتلایا گیا کہ یہ ریاست کا دستور قدیم ہے اور دوسرے افسر ل...

اس نذرانہ کو قبول کر لیا ہے۔ مگر انہوں نے نہایت سختی سے اس ہدیہ کے لینے سے انکار کیا۔ اور یہی نہیں بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس لقمہ تر کے اُگلنے پر مجبور کیا۔ نوساری کی کمشنری کے زمانہ میں جب وہ غربا کے لئے زمین کی جبری خریداری کے خلاف سعی فرما تھے تو دولت مند اور ذی اثر پارسیوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں گیا۔ جس میں ہندوستان کے دولت مند ترین خاندان ٹاٹا کے بعض ارکان بھی شامل تھے۔ اس وفد نے خواہش کی۔ کہ وہ از راہ عنایت اس معاملہ کو حسب سابق برقرار رہنے دیں اور انہیں ممنون فرمائیں۔ مگر مسٹر محمد علی کا سادہ و صاف جواب یہ تھا کہ ظلم معلوم ہونے پر وہ اس کی پردہ پوشی نہیں کرنا چاہتے ؏

ان کے نہایت سختی سے اصول دیانت کا پابند ہونے کی وجہ سے بعض حکام انکے مخالف ہو گئے تھے۔ اور اکثر مہاراجہ تک انکی شکایت لیجانے رہتے تھے۔ مگر مہاراجہ انہیں ذہنی و اخلاقی قابلیتوں کیوجہ سے نہایت عزیز رکھتے تھے۔ اور ان شکایات پر کان نہیں دھرتے تھے ؏

ریاست کی ملازمت کے دوران میں مسٹر محمد علی اپنے طبعی مذاق علمی کیوجہ سے کبھی کبھی ٹائمز آف انڈیا وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے ؏ جنہیں انگریز اور ہندوستانی بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ان کے ابتدائی مضامین موجودہ بے چینی پر چند خیالات کے عنوان سے علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے۔ جن کی لارڈ منٹو نے بہت کچھ تعریف کی ؏

علیگڈھ کے متعلق بھی ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے۔ بارے منٹو سکیم کے متعلق اِن کا سلسلہ مضامین شایع ہونے پر ہندوستان کے مشہور لیڈر مسٹر گوکھلے آنجہانی سے اِن کا تحریری مباحثہ چھڑ گیا جسمیں انہوں نے انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا۔

علاوہ ازیں انہیں ایام میں انکی ارادت سے ایک مشہور انگریزی رسالہ "گپ" الہ آباد سے نکلا۔ یہ رسالہ اپنی دلچسپیوں اور مسخر انگیزیوں کی وجہ سے کشت زعفران تھا مگر اسکے دو سے زیادہ نمبر شایع نہیں ہو سکے۔

کامریڈ

مگر مسٹر محمد علی کی چلبلی طبیعت کے لئیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ ایک ریاست کے انتظامی امور میں مصروف رہ کر زندگی بسر کر دیں۔ اور جس حلقہ کے لئے خدا نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اسمیں داخل نہ ہوں۔ انکی ادبی قابلیت صرف ہندوستانیوں میں نہیں۔ بلکہ انگریزوں میں بھی شہرت پذیر تھی۔ ٹائمز آف انڈیا۔ انڈین سپکٹیٹر اور ہندوستان ریویو جیسے اخبارات و رسایل کے ایڈیٹران سے مضامین لکھوانے کی خواہش کرتے تھے اور اس سے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان کی تحریری قوت کا صحیح مرتبہ کیا ہے

علاوہ ازیں ہندوستان اب سیاسیات کا مرکز بن رہا تھا اور خود ان کے ہم مذہب بھی تعلیم کے علاوہ سیاست کے میدان میں گام زن ہونا چاہتے تھے۔ پھر ایسے وقت میں ضرور تھا کہ محمد علی کا سا پرجوش وملت پرست شخص اسی میدان میں اُترے۔

مگر ریاست کی معزز و محترم اسامی اور گرانقدر تنخواہ چھوڑنا ایک ایسا امر تھا۔ جسے شاید اس زمانے میں کوئی ہندوستانی پسند نہ کرتا۔ یقیناً یہ ایک عظیم الشان قربانی تھی۔ اور صرف محمد علی کا ہی دل اسے برداشت کر سکتا تھا۔

مہاراجہ کی عنایت سے انہیں دو سال کی رخصت مل گئی۔ اور وہ بھی کلکتہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ کہ ہز ہائینس نواب جاورہ نے انہیں عہدہ وزارت کے لئے انتخاب کیا محمد علی کے لئے یہ دوسری بڑی آزمایش تھی۔ وزارت کا سا ممتاز ذمہ دار عہدہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کا منتہائے مقصود ہے اور وہ انہیں بلا طلب حاصل تھا۔ مگر انہوں نے نواب کے اصرار اور لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش کے باوجود اسے قبول نہیں کیا۔

ان سخت ترین علایق سے دامن بچا کہ وہ کلکتہ پہونچے اور انہوں نے اپنا مشہور اخبار کامریڈ نکالا۔ اس کا پہلا نمبر ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۱۱ع کو شایع ہوا۔ اسکی پالیسی کی نسبت انہوں نے تحریر کیا۔ کہ ہم سب کے دوست ہیں اور کسی کے طرفدار نہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کے مختلف گروہ آپس میں متحد ہو جائیں۔ اور ہمیں ان کے جھگڑے پسند نہیں حکومت کے متعلق لکھا کہ حکمران و محکوم طبقوں کو شاعر کے تخیل کی تکمیل کرنی چاہئے

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کامریڈ کیپلنگ کی تھیوری کے بالکل خلاف تھا اور مشرق و مغرب کے اتحاد کی امید رکھتا تھا۔ اس کے لئے وہ خود بھی کوشاں تھا۔ وہ برٹش گورنمنٹ کے قیام کا حامی تھا اور

اس کی نکتہ چینی محض انتظامی معاملات تک محدود تھی ٭

وہ ہندو مسلم اتحاد کا موید تھا۔ تاہم مسلمانوں کے مستقل حقوق کے لئے وہ بھی ساعی تھا اور جب کبھی اس مسئلہ کے متعلق اس کی تحریریں شائع ہوئیں تو اپنے زوردار انداز تحریر کی وجہ سے سرکاری حلقوں میں دلچسپی سے دیکھی جاتی تھیں ٭

مسٹر محمد علی کے مخصوص انداز بیان، زوردار اور مدلل طریق تحریر اور مسلمہ انشاپردازی کی وجہ سے کامریڈ بہت جلد مقبول ہو گیا۔ غیر سرکاری حلقوں کے علاوہ خود سرکاری حلقہ بھی اس کا مداح و معترف تھا۔ اور اسکی لطیف تنقید کا برا نہیں مانتا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ۔ لیڈی ہارڈنگ۔ سر جیمس مسٹن۔ سر ولسن۔ سر فرینرر۔ سر کلیو لینڈ وغیرہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتے اور اسکی تعریف کرتے تھے۔ ہندوستان کے علاوہ انگلستان، مصر اور ٹرکی میں بھی اس کے خریداروں کا حلقہ پھیل گیا۔ مصر کے مشہور اخبارات اللواء العلم اور المؤید اس کے مضامین شائع کرتے رہتے تھے۔ اور ٹرکی کا مشہور مصور جرنل ثروت فنون اکثر اس کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا ٭

انقلاب خیالات و آرا

مسلمانان ہند کی تاریخ جدید نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ سب سے پہلے وہ تعلیم جدید کے اشد شدید مخالف تھے۔ اور اسے مذہبی حیثیت سے ناجائز اور حرام خیال کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا مذہب مقدس ہر طرح کے علوم کی ضیا پاشی کو صرف

جائز ہی نہیں۔ بلکہ ضروری خیال کرتا ہے۔ اور یہ انہیں کی قوم تھی، جس نے یونانی علم و فنون کو ہی محفوظ نہیں کیا۔ بلکہ اسمیں بہت سے مفید اضافات کرنے کے علاوہ مستقل علوم ایجاد کئے ٭

مسلمانوں کی اس بے جا مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تقریباً نصف صدی ضروریات زمانہ کے مطابق نہیں چل سکے۔ بالآخر سر سید مرحوم اور نواب محسن الملک وغیرہ اصحاب کی مساعی جمیلہ سے یہ کفر خدا خدا کر کے ٹوٹا اور مسلمان بھی مغربی علوم سے بہرہ ور ہونے لگے۔

برٹش گورنمنٹ ان حضرات کی مساعی کی معاون تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں تعلیم جدید مسلمانان ہند کے اس تعصب کو دور کرنے کے لئے بہترین راستہ تھا۔ جو ان میں مذہبی حیثیت سے کام کرتا ہوا نظر آتا تھا ٭

ہندوستان میں برٹش حکومت کو متعدد دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے انہیں مسلمانوں کے غدر حکومت۔ جوش جہاد اور روح آزادی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس حالت میں انہوں نے ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانے کی سعی کی۔ ان میں عام طور پر انگریزی تعلیم پھیلا دی۔ اور جدید تمدن کے برکات سے انہیں بہرہ ور کیا ٭

مسلمانوں میں اس وقت عام خیال یہ تھا کہ مسلمان دنیا میں صرف حکومت کیلئے آئے ہیں اور محکومی و ماتحتی ایک ایسا گناہ ہے۔ جسے مسلمانوں کو کسی حالت میں رضامندی سے اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ نیز وہ جہاد کو ایک مقدس فرض خیال کرتے تھے ٭

حکومت برطانیہ کے لئے یہ عام عقیدہ بڑی ہی مصیبت تھا۔ اور وہ اس کے ازالہ کے لئے بہت کچھ سعی کر رہے تھے۔ مگر کوئی صورت اس کی کامرانی کی نہیں تھی ٭

اگرچہ ہندؤں کو ایک مخصوص رتبہ دینے سے برطانیہ کو امید تھی کہ وہ تقسیم و تفریق کی پالیسی میں کامیاب ہو چکی ہے۔ مگر غدر کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اتحاد کی قدیم لہریں ابھی تک جمنا اور گومتی میں موج زن ہیں۔ اور حکومت برطانیہ کی بنیادیں کچھ زیادہ استوار نہیں ہیں ؛

اس کے ساتھ مسلمانوں کا جوش جہاد و مقاتلہ فی سبیل اللہ کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا ان کا ایک مشہور و معروف فرقہ ہر وقت اسی کی فکر میں رہتا اور دوسرے مسلمان اسکی اعانت و ہمدردی سے دریغ نہیں کرتے تھے ؛

اسی عرصہ میں اس کے لئے ایک اور دقت واقع ہوئی۔ ہندؤں کو اسنے اسلئے تعلیم دی تھی۔ کہ وہ اس کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے جنگی جوش کا مقابلہ کریں۔ مگر یہاں مغربی تعلیم و خیالات نے ان کے جذبات بھی برانگیختہ کئے اور وہ ملکی حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس پیچیدہ اور مشکل حالت میں حکومت برطانیہ مبتلا تھی۔ کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی تعلیمی تحریک شروع کی۔ اور اپنی بے مثل قابلیت۔ جوش اور استقلال سے کام کرنا شروع کیا۔ گورنمنٹ نے اس تحریک کو غنیمت سمجھا اور اسے اپنے مقاصد کا آلہ بنانا چاہا۔ سر سید بھی گورنمنٹ کی اس اعانت کو اپنے لئے مفید سمجھے کیونکہ وہ سرکاری اعانت کے بغیر قومی مخالفت سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے تھے ؛

بزرگ سید کیجگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کی اس وقت کی متفقہ مخالفت کا کبھی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ان کے غیر معمولی قوائے ذہنی و اخلاقی

بے مثل ہمدردیٔ اسلامی و جوشِ قومی ایثار و قربانی اور صداقت و اخلاص نے انکی تمام دقتیں دور کر دیں اور وہ اپنی مساعی جمیلہ میں کامیاب ہوئے۔

مگر جہاں سید مرحوم کی مساعی سے اِن کی قوم کو فایدہ پہونچا۔ وہاں حکومتِ برطانیہ کو بھی اِن کی ذات سے غیر معمولی تقویت ہوئی۔ درحقیقت گورنمنٹ کی توقعات امید سے زیادہ ان کی تحریک سے بر آئیں۔ ایک طرف تو مسلمانوں کا وہ تعصب مذہبی۔ حمیت دینی اور فریضہ جہاد کا ولولہ جاتا رہا۔ اور وہ تعلیم جدید کے کچھ ایسے والہ و شیدا ہوئے کہ عملاً انہوں نے اپنے مذہبی اصولوں کو بالکل چھوڑ دیا۔ دوسری طرف ان کے اکثر رہبر حکومت کی اطاعت و وفاداری کا وعظ کہنے لگے اور "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" وغیرہ آیات و احادیث کے حوالے سے مسلمانوں کو تبلانے لگے۔ کہ حکومت وقت کی وفاداری میں اگر جانبازی و سرفروشی کی نوبت آئی۔ تو یہ عین شہادت ہے۔

سرسید مرحوم نیک نیت آدمی تھے اور ان کے مسلمہ ایثار اسلامی و اسلام پرستی میں شبہ کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ تاہم وہ انسان تھے۔ اور انسان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی وفاداری کے وعظ اور کانگریس کی مخالفت سے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس پر چلنے سے مسلمان منزلِ مقصود سے بہت دور چلے گئے سرسید درحقیقت مجبور تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی اقوام نے جدید تعلیم و تمدن کی وجہ سے ترقی کی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان بھی اس راستہ پر چلکر کامیاب نہ ہوں

اِس عظیم الشان مقصد کے حصول کے لئے وہ یقیناً گورنمنٹ کی اعانت کے محتاج تھے۔ اور اس لئے انہیں اِس روش کو اختیار کرنا پڑا۔ مگر بڑی مصیبت یہ ہوئی۔ کہ ان کے بعد ان کے احباب و متبعین نے انہیں عقل کل تسلیم کیا۔ اور ان کے اجتہاد میں کسی طرح کے شک کرنے کو بھی کفر سمجھا۔ اگر سر سید مرحوم کے بعد فوراً ہر مسلمان لیڈر مرکز اصلی کی طرف متوجہ ہو جاتے تو کچھ زیادہ دقت واقع نہ ہوتی۔ اور اب یہ بسہولت ممکن تھا۔ کیونکہ مرحوم سر سید کا عظیم الشان دار العلوم مستقل حیثیت اختیار کر چکا تھا ؛

بہر حال اب مسلمان گورنمنٹ کے بلا معاوضہ سپاہی تھے اور وہ اپنے ہموطنوں کے مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت گورنمنٹ کا ساتھ دیتے تھے۔ حکومت کا بھی یہ حال تھا۔ کہ جہاں ہندوؤں نے مطالبات کی کلوخ اندازی سے کام دیا۔ وہیں اسنے مسلمانوں کو سنگ باری کا حکم دے دیا۔

کلوخ انداز را پاداش سنگ است

امید نہیں کہ جب یہ تعلیم کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تو مسلمان اِس خواب مقناطیسی سے چونکیں گے اور اپنے اِن مضحکہ انگیز اعمال پر متاسف ہونگے ؛

مگر گورنمنٹ اس فکر سے غافل نہیں تھی۔ اسنے اپنے ایجنٹوں کی معرفت انہیں حقوقِ ملازمت کے مطالبہ کی طرف متوجہ کیا۔ اور اب یہ مجنون قوم لیلائے ملازمت کے پیچھے آوارہ و سرگرداں تھے جس قوم کو خداوند کریم نے دنیا میں اِسلئے پیدا کیا تھا کہ وہ حاکم و فاتح ہو اور دوسری قومیں اس کے سامنے سر بسجود اور گردن خمیدہ ہوں۔ آج وہ اِسلئے

بے چین ہے کہ اس کی جبین نیاز اہلِ فرنگ کے گردِ پا سے کیوں محروم ہے ۔ اِن ھذا من اعاجیب الزمن ۔

مُسلم لیگ

دنیا کے عجائب و غرائب میں ایک ہندوستان کی زیادش بخیر مسلم لیگ بھی ہے جس کا وجود سیاست کے لئے مخصوص تھا ۔ مگر جس میں سیاست کے حروف بھی بلند آہنگی کے ساتھ بولنے کی اجازت نہ تھی ۔ سیاست کا مقصود ملکی حکومت کا مطالبہ اور انتظامی معاملات کی اصلاح ہے ۔ مگر ہماری مسلم لیگ کے مقاصد سیاسی کی پہلی دفعہ حکومت وقت کی اطاعت و وفاداری پر مبنی تھی ۔ اور اس کی دوسری دفعہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا ۔ اس کے سالانہ جلسے کی کارروائیوں میں گورنمنٹ سے بصد عجز و نیاز و بہ ہزار تذلل و انکسار و بکمال خشوع و خضوع نہایت اطاعت و وفاداری کے ساتھ عرض کیا جاتا تھا ۔ کہ فلاں جگہ خالی ہوتی ہے ۔ ازرہ مراحم خسروانہ ابکے اس زنجیر ملازمت میں کسی مسلمان کو منسلک کیا جائے ۔

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ اندازند
چرا بہ گردنِ حافظ نمے نہی رسنے

اور بارگاہ عالی سے جواب ملتا کہ ہا بدولت اس سے بے خبر نہیں ہے ۔

درِ حضرتِ کریم تقاضا چہ حاجت است

اور یا یہ ماتم کیا جاتا کہ ہندو بڑھ گئے اور ہمارے لئے حسرت وارمان چھوڑ گئے۔ اور تجویز کیجاتی کہ ان کا دامن دراز اپنے دستِ کوتاہ میں دیا جائے۔ مگر جب حکومت کی توجہات و عنایات کے باوجود آستین بتِ ہندو تک رسائی نہ ہوتی۔ تو پھر اپنا ہی دامن کافی سمجھا جاتا۔

ہمارا ابھی تو بس چلتا ہے اُٹھ اپنے داماں پر

مسلم لیگ کو اس لئے معرض وجود میں لایا گیا تھا کہ مسلمان گلشن سید کے شجر ممنوعہ سیاست کے لئے بے چین ہو گئے تھے۔ شیطان کے اغوا نے انہیں سرسید کے حکم واجب الطاعت سے منحرف کر دیا تھا۔ اور وہ اب اس درخت کے ثمر تلخ سے اپنی مدہوشی و بے خبری دور کرنا چاہتے تھے +

وہ جب کبھی اپنے ہندو احباب سے ملتے تو انہیں ایں رہ اطاعت و وفا کیشی اور منزل تسلیم و رضا کا افسانہ عشق سناتے اور محبوب کے حسن و قبول کی متاع عزیز سے ان کی آوارگی و شورش پسندی کا مقابلہ کرتے +

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

وہاں سے جواب ملتا کہ تم حقیقت عشق سے بے خبر اور طریق محبت سے ناآشنا ہو۔ یہاں شوریدہ سری اور وارفتگی مزاج پختہ کاری اور کامرانی کی دلیل ہے۔

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ

پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پاست

یہ مقام بحث و مناظرہ کا نہیں بلکہ ذوق و وجدان کا ہے۔

زاہد امید رحمت حق اور ہجو... ئے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

کچھ مسلمان بڑھے اور انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ میگساری و مے آشامی اختیار کی مسلمانوں نے دیکھا کہ یہ بھی ایسے بے خود و سرشار ہو گئے ہیں کہ انہیں اطاعت و تسلیم کی راہ قدیم کی پرواہ نہیں رہی۔ اب تو وہ مضطرب و بے قرار ہو گئے اور انہوں نے رندی و بادہ آشامی کی ٹھان لی۔ بزرگان علیگڈھ نے دیکھا کہ میخانہ سیاست کی بادہ مستیاں انکی خانقاہ تعلیم کو گرد آلود کر دیں گی۔ اور پھر ان کے بنائے نہ بنے گی۔ وہ جھٹ اپنی دستار علم اچھالتے ہوئے بحالت رندی و مستی قوم کے سامنے آئے۔ اور ایک نیا میکدہ مسلم لیگ بنا کر خود پیر مغاں بن بیٹھے مگر اسمیں انہوں نے وہی چہل سالہ بیکار و فرسودہ شراب اطاعت جام وفاداری میں بھر کر پلانا شروع کی۔ اسمیں کچھ ایسا داروئے بیہوشی ملا دیا کہ قوم پھر خواب غفلت میں مبتلا ہو گئی ٭

یہ مسلم لیگ کی بنیاد کی حقیقت ہے

مسلم یونیورسٹی

مسلم لیگ کا نشہ بے ہوشی گو بہت تیز تھا۔ مگر زمانے کی ٹھوکروں کی ترشی اس سے تیز تر تھی۔ ابھی علیگڈھ کے اس نسخہ جدید پر پوری پانچ گرمیاں بھی نہیں اگری

تھیں کہ تنسیخ تقسیم بنگال کی ترش و تلخ ٹھوکر مسلمانوں کے خمار کا اُتار ثابت ہوئی۔ وہ یک بیک چونک پڑے اور اُٹھکر انہوں نے جو دیکھا تو ہاتھ خالی تھے۔ اور جس شاہد مقصود کے لئے یہ سرشاری و بیخودی تھی وہ بہت دور چلا گیا تھا +

نکل گیا ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے

تاہم شاہ انگلستان کی یہ ٹھوکر مسیحائی کا کام کر گئی اور مسلمانوں نے ارادہ کر لیا گو وہ مقصود محبوب سے بہت دور ہیں۔ مگر اب وہ جس طرح بھی بن پڑے گا۔ اسکی مجنونانہ تلاش کریں گے اور یا تو اِسے حاصل کریں گے۔ یا اس کے عشق طلب میں اپنی ہستی مٹا دیں گے +

یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

چنانچہ مسلمان اپنے محترم لیڈر نواب وقار الملک مرحوم کے ساتھ تلاش یار میں مجنونانہ کوہ و بیابان کی پیمایش کرنے لگے۔ مگر ابھی پہلی منزل میں تھے کہ یارانِ شاطر کی عیاری و چالاکی سے اُنہیں ایک نظر فریب بت طلائی ہاتھ آیا۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ یہی وہ محبوبِ جاں نواز اور حاصلِ عشق ہے جس کے لئے وہ طریق فرہاد و مشرب قیس پر چل رہے تھے۔ پھر کیا تھا وہ بنی اسرائیل کی طرح اِس گئو سالہ سامری کی پرستش میں مشغول ہو گئے۔ اور کچھ اس طرح بے خبر ہوئے کہ گرد و پیش کے حالات سے بھی متاثر نہیں ہوتے +

یہ زرنگار آغا خانی بت مسلم یونیورسٹی تھا۔

ایک سال کی مسلسل پرستش و تعبد کے بعد جب ہوش و حواس کسیقدر ٹھکانے ہوئے اور گرمی کی دھوپ اور جاڑے کی سردی نے ان کی پرستارانہ قوتوں کو کسیقدر ضعیف کیا۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ سنہری بُت اندر سے کھوکھلا ہے اور اسمیں سومنات کے بُت کیطرح لعل و جواہر نہیں۔ بلکہ ایک کشادہ دہن اژدہا ہے۔ جو ان میں بہتوں کو نگل چکا ہے۔ اور باقی کی فکر میں ہے۔ اب تو مسلمان گھبرا کر بھاگے۔ یہ اژدر عظیم بھی اپنا دہان طمع پھیلاتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگا۔ مگر ایک آدھ کے سوا پھر اس کے ہاتھ کوئی نہیں آیا اور وہ بھی اپنے پچھلے شکار پر مطمئن ہوگیا *

مسٹر محمد علی

ٹھیک اس وقت مسٹر محمد علی کی مساعی جمیلہ کا ظہور ہوا۔ اور انکی قابلیت کار۔ آزادی رائے اور جوش اسلامی سے مسلمانوں کا گروہ عظیم ان دلالوں سے نکل گیا۔

خود محمد علی ابتدا میں انگریزی و دولت مند حلقہ اثر سے متاثر تھے۔ بڑے سے بڑے انگریز افسر انہیں نہایت عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سر سٹن سر کلیفیڈ سر فریزر وغیرہ اصحاب ان کے ذاتی دوست تھے۔ اکثر ارباب دول و رؤسا سے بھی انکے مراسم دوستانہ تھے۔ سر راجہ محمود آباد۔ سر آغا خاں۔ سر سلیم اللہ سے ان کے تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ یہ اصحاب انکے اخبار کامریڈ کی اشاعت میں حصہ لیتے تھے۔ علاوہ ازیں خود محمد علی علیگڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اور وہاں کے خیالات و آرا سے ایک

حد تک متاثر تھے۔ ان حالات میں انکے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ یک بیک گورنمنٹ
ارباب دول اور علیگڈھ پارٹی کے خلاف ہنگامہ آرا ہوتے۔ درحقیقت ان کی کوشش تھی
کہ گورنمنٹ کے خلاف شورش نہ پھیلنے دیں۔ اور گورنمنٹ کو پبلک کے جذبات
احترام پر آمادہ کریں۔ علیگڈھ پارٹی کے متعلق بھی وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ ان کے معائب
و نقایص کے اظہار کے بعد انہیں صداقت اور آزادی سے پبلک کے جذبات گورنمنٹ
تک پہنچانے پر آمادہ کریں اور اس طرح خود بھی انکے ساتھ رہیں۔ ظاہر ہے کہ انکی
یہ خواہش پوری ہونی مشکل تھی۔ تاہم وہ استقلال سے اس راستے پر جادہ پیما تھے۔

مولانا ابوالکلام

مولانا ابوالکلام نے چاہا کہ انہیں اس راستہ سے منحرف کریں اور انہیں
کہ تبکدہ کی شکستگی کے بغیر اذان کی آواز کی توقع نہ رکھیں۔ مگر انہوں نے یہ کہکر ٹال دیا

غلط سہی اثر آہ و نالہ پر ناظم
رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اور فی الحقیقت جن تعلقات کی زنجیروں میں وہ بندھے ہوتے تھے انکو دیکھتے ہوئے
ان کے لئے کام کا بھی بہترین راستہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ یہ علایق بعض اوقات انہیں
رہ راست سے منحرف کر دیتے تھے جیسا کہ مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ لکھنؤ میں
ہوا جسمیں وہ پہلے روز مولانا ابوالکلام وغیرہ کے ہم آہنگ تھے اور دوسرے روز ساجد

صاحب محمود آباد کی دوستانہ معروضات کیوجہ سے ان کے ہم نوا ہو گئے۔ یا جیسا کہ لارڈ منٹو کی خدمت میں بالاصرورت ڈیپوٹیشن لیجاتے ہوئے وہ بھی چہل سالہ فرض وفاداری کا وعظ کہتے ہوئے سر سید کی شریعت کے حامل ہو گئے تھے۔ مگر جو لوگ افراد کی تاریخ پر گہری نظر ڈال سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تعلقات میں اس قسم کے واقعات گاہ گاہ رونما ہو جاتے ہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ ارباب عمل ان طریق کار کو اپنے ضمیر ورائے کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں وہ ضمیر فروشی کے مجرم ہونگے بلکہ اس لئے کہ احباب کے خیالات و آرا کا دوستانہ حیثیت سے بار بار سننا غیر معلوم مخفی طریق پر ضمیر ورائے کو متاثر کرتا ہے اور ذہن کسی ایسے راستہ کو فوراً اختیار کر لیتا ہے۔ جو معتدل اور غیر مضر ہو۔ یہی وجہ تھی کہ سر سید جیسے اسلام دوست اور قوم پرست شخص نے بعض ان حالات سے بالکل غض بصر کر لیا جن کی طرف کانگریس اڑ کی کے تعلقات کا فیصلہ کرنے سے پہلے انہیں نظر ڈالنی چاہئے تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ گوکھلے آنجہانی جیسے محب وطن نے پریس ایکٹ کے حق میں رائے دی اور اپنی اس رائے کی صحت پر اس قدر اصرار کیا کہ سر سنہا کو استعفا دینے پر مجبور کیا۔

درحقیقت لطف و نوازش اور عنایت و محبت کی زنجیریں قہر و جبر کے بند و سلاسل سے کہیں زیادہ کڑی اور سخت ہوتی ہیں۔ انسانوں کی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ ظلم و جبر کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتا ہے۔ مگر لطف و کرم ایک ایسا آلہ بے پناہ ہے کہ جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ جب تک مظالم شاہی کا

شکار رہے۔ انہیں کسی طرح کے تزلزل کا خوف نہیں تھا۔ مگر جب نظر سلطانی نے لطف وکرم کے لئے چن لیا۔ تو وہ مضطرب ہو گئے۔ اور اس عظیم آزمایش کا مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔

حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ جب اپنے احباب سمیت لطف شاہنشہی کی کش کے لئے بلائے گئے تو وہ متفکر تھے۔ مگر جب اسکے رد و انکار سے وہ قید مقدس زنجیروں کو پازیب وگلو آرا کر چکے تو پھر ابتلا و آزمایش سے بے پروا فی الحقیقت یہ بزرگان دائمہ کرام کی شان ہے اور اسے ہر شخص شروع حاصل نہیں کرسکتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ سچ ہے کہ مولانا ابوالکلام اپنی مثال پیش کر کے کہہ سکتے ہیں۔

دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

مگر ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ مولانا کو مسٹر محمد علی کے سے حلقہ احباب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر یہ بحث لاحاصل ہے۔ مسٹر محمد علی آج اپنی قوم کے سامنے بصورت اجمل نمایاں ہیں۔ اور اب وہ یقیناً اپنے رفیق جلیل و عزیز مہاتما گاندھی کی طرح تمام تعلقات سے بے پرواہ اور حکومت کے دام فریب سے بالاتر ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے مسٹر لائیڈ جارج اور مسٹر فشر مسٹر محمد علی سے رفق و مدارات کے ساتھ پیش آئے اور ایک مصالحت کا جال بھی بچھایا۔ مگر محمد علی نے صاف کہہ دیا۔

بروایں دام بر مرغِ دگر نہ — ہمارا ہم بلند است آشیانہ

پھر محمد علی کے اِن تعلقات کے گرانبہا نتائج کو نہ بھلائیں۔ معاملہ کانپور میں انکے
قات نے جو کچھ کام کیا وہ نہایت دقیع ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد کو زیادہ تر انہی کی
اعی نے روشناس سیاست کیا اور وہ مدتوں لیگ اور کانگریس کے تیز و گرم ممبر رہے
وس ہے کہ راجہ صاحب کی شیوہ طرازی بھی اسی دام محبت کے حلقوں کا نتیجہ تھے۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

جب تک مسٹر جیمس مسٹن آلات جبر و قہر سے کام لیتے رہے تو وہ بھی اپنی تیغ
دی سے گرم پیکار رہے اور انہیں وہ صرف مدافعانہ پہلو ہی اختیار نہیں کرتے
ے۔ بلکہ ہجوم واقدام تک نوبت تھی۔ یہ حالت اخیر تک رہی اور جب غریب مسٹن
یس جارہا تھا تو اس وقت بھی انہوں نے ایک آخری وار سے دریغ نہیں کیا۔ اِیکے
ر راجہ صاحب کے قدیم دوست مسٹر بٹلر آئے اور انہوں نے کمان مصلحت سے ایک
ما تیر محبت تاک کر مارا کہ راجہ صاحب جگر مجروح و قلب دیوانہ کے ساتھ ناوک افگن کے
منے سر جھکا بیٹھے۔

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور ایک آپ ہی نہیں بلکہ دو چار اور کو بھی ساتھ لیتے گئے۔

خوش طبیبے است بیا تا ہمہ بیمار شویم

اور ایک راجہ صاحب کو کیا روئیے یہاں تو اکثر یارانِ محفل کا یہ حال ہے کہ

وہ کسی کی حریف نوازی اور دلربائی کا شکار ہو چکے ہیں نیستان بنگالہ کا وہ شیر ج

دسر نیدر ناتھ بینرجی) جس کی صدائے رعد آسا سے وسیع بر اعظم ہند کی فض

اٹھتی تھی۔ آج برضا و رغبت دفتری اقتدار کے جال میں مقید ہے۔ الہ آباد کا وہ

نظر عقاب (چنتامنی) جس کا تخیل آسمان کے تارے توڑ لاتا تھا۔ آج

حکومت کے قفس کی تیلیاں گن رہا ہے۔ اور پونہ کا وہ مشہور عندلیب ہزار داستا

(پرانجپے) جس کے علمی نغمے آج تک افسانہ بزم و انجمن ہیں۔ آج خود

صیاد کے پنجۂ آہنی میں خاموش ہے۔ اور پھر افسوس یہ ہے کہ انہیں اپنی اس گرفتا

اور مردہ زندگی پر افسوس نہیں ہے ؛

نہ داغ تازہ مے خاردنہ زخم کہنہ مے کارد

بدہ یارب دلے کیں صورتِ بے جاں نمے خواہم

نواب وقار الملک

مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی کے ذیل میں سب سے محترم نام نواب وقار الملک

مرحوم کا آتا ہے۔ نواب صاحب ہی درحقیقت ہندوستان میں جدید خیالات کی تو

کے بانی ہوئے ہیں مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں بھی انہوں نے آ

خیالی سے کام لیا اور مسلمانوں کو باغ سیاست کی گلگشت کے لیے آمادہ کیا ؛

نواب وقار الملک کے ساتھ ہی مسٹر محمد علی کی مساعی بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اور لکھنؤ کے جلسے کے سوا انہوں نے ہمیشہ نواب صاحب مرحوم کے دوش بدوش کام کیا ہے نواب صاحب کی علالت کے بعد علیگڑھ پارٹی میں فی الحقیقت مسٹر محمد علی ہی ان کے جانشین ہوتے اور قوم میں آزادی کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

نواب صاحب مرحوم اور مسٹر محمد علی کی اس سعی کی رفتار یقیناً سست تھی۔ مگر وقت کا تقاضا غالباً یہی تھا۔ اور اگر بے صبری کے ساتھ کام کیا جاتا تو ممکن تھا۔ کہ رہروانِ طریق کا قدم ساتھ نہ چلتا۔

مسٹر محمد علی کی اس مصالحت آمیز روش کا نتیجہ یہ تھا کہ آنریبل مسٹر محمد شفیع جیسے افراد بھی لیگ کا نصب العین حکومت خود اختیاری قرار دینے لگ گئے۔ حالانکہ میاں صاحب موصوف کا طریق کار اس آئیڈیل کی ٹھیک ضد پر لے جانے والا تھا۔ جب آنریبل میاں محمد شفیع نے لیگ کی صدارت کا ایڈریس مرتب کرتے ہوئے مسٹر محمد علی سے مشورہ کیا تو انہوں نے صاف کہدیا۔"

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جب میاں محمد شفیع نے مذکورہ آئیڈیل کا اعلان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ گویا انہیں معلوم نہیں تھا کہ میاں صاحب کے پیچھے کونسی طاقت انہیں نظارہ فرمائے جمال دوست کر رہی ہے۔

صد جنت جلوہ بہ نا ہد و ہر صد راہ دوست انداک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

. . . .

اور یہ فی الحقیقت انہیں کی مؤثر مساعی کا نتیجہ تھا۔ کہ جب تک وہ آزاد رہے اکثر مسلم لیڈر الحاقی یونیورسٹی کے طرفدار تھے۔ مگر انکی اور مولانا ابوالکلام کی نظربندی کے زمانے میں ۸۔ اپریل ۱۹۱۷ء کو مقامی یونیورسٹی لینے کا فیصلہ کیا گیا ؛

ہمدرد

دارالخلافہ کی تبدیلی کیوجہ سے ۱۹۱۲ء میں مسٹر محمد علی دہلی چلے گئے اور یہاں انہوں نے بڑے پیمانے پر ایک اردو روزانہ اخبار نکالنے کا اعلان کیا۔ اس کے لئے انہوں نے بیروت کے ٹائپ کے لئے آرڈر دیا۔ بدقسمتی سے اس فرمائش کی تعمیل میں غیرمعمولی تاخیر ہوگئی اور پبلک کا انتظار مایوسی سے بدل گیا۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر جو اس کے چیف ایڈیٹر قرار پائے تھے، واپس چلے گئے۔ تاہم مسٹر محمد علی کی مساعی کا کئی ماہ کے بعد نتیجہ نکلا اور ہمدرد کا ٹائپ آنے پر جون ۱۹۱۳ء میں ڈمی کاغذ کی چوتھائی تقطیع پر شایع ہونا شروع ہوا۔ اس کا کاغذ دبیز اور چکنا اور ضخامت ۸ صفحے کی تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی اردو روزانہ اخبار ٹائپ کے حروف میں شایع نہیں ہوا۔ مسٹر محمد علی کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اور انہیں اس کے لئے بہت کچھ مالی قربانی کرنی پڑی۔ مگر ابھی ایک سال کا عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اس ٹائپ کے حروف کے دندانے و اشکال مندرس ہوگئے۔ اور ان کا پڑھنا مشکل ہوگیا تھا۔ خریدار جو ٹائپ سے پہلے ہی

گھبرائے ہوئے تھے۔ شدت سے تقاضا کرنے لگے۔ کہ لیتھو کی چھپائی ہونی چاہیئے۔ اور بالآخر انکی متواتر آواز اور ٹائپ کی دقتیں لیتھو کی چھپائی کا موجب ہوئیں ؂

یہ ظاہر ہے کہ ٹائپ کا مسئلہ کبھی نہ کبھی حل کرنا پڑے گا۔ اور لیتھو کی بدعت جبتک دور نہ ہوگی۔ اس وقت تک اردو مطبوعات کی ترقی کے لئے سنگ راہ ثابت ہوگا۔ مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کے عام اشخاص نستعلیق حروف کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ وہ اس رسم قدیم کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔

مسٹر محمد علی نے ٹائپ کو رواج دینے کے لئے جو شدید ترین مالی نقصانات برداشت کئے ان کی نظیر اردو پریس میں بہت کم مل سکتی ہے اور اگرچہ وہ اپنے مقصود میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تاہم اسمیں شک نہیں۔ کہ الہلال اور ہمدرد کی وجہ سے بہت سے اصحاب ٹائپ کے حروف پڑھنے کے عادی ہو گئے۔

نستعلیق حروف میں چھپنے کے بعد ہمدرد بہت جلد مقبول عام ہو گیا۔ اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں وہ بکثرت بکتا تھا۔ اردو روزانہ اخبارات میں زمیندار کے سوا اور کوئی اخبار کثرت اشاعت میں ہمدرد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہمدرد عوام کا بہترین ترجمان اور مصلح کار تھا ؂

کامریڈ اور ہمدرد کے سٹاف میں بھی متعدد قابل اہل قلم تھے۔ راجہ غلام حسین مرحوم میر جالب دہلوی۔ اور قاضی عبدالغفار کے علاوہ بعض اور اصحاب بھی اسمیں کام کرتے تھے ؂

محمد علی کی نظر بندی کے بعد بھی ہمدرد جاری رہا اور وہ خود بھی اس کے لئے بعض دلچسپ مضامین لکھتے رہے۔ مگر جب جناب سنسر نے اپنی تیغ تیز سے اسے مجروح کرنا شروع کیا تو بمجبوری اسے بند کیا گیا ؞

میڈیکل مشن

سرکاری حلقوں میں اکثر مسٹر محمد علی ترکوں کی محبت سے متہم کئے گئے ہیں۔ اس جرم محبت میں انہیں بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے بھی اس راہ عشق سے کبھی منہ نہیں موڑا اور ہمیشہ یہ کہکر ارباب عقوبت و تعزیر کی آمادگی میں اضافہ کیا۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب ۔ بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

جنگ بلقان میں جب ترکوں کی بے سر و سامانی کی خبریں پہنچیں۔ تو وہ بے چین ہو گئے اور اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک طبی مشن بھیجنے کی تجویز شائع کی۔ یہ تجویز بہت جلد مقبول ہو گئی۔ اور پندرہ دسمبر سنہ ۱۹۱۲ کو ایک مشن بھیجا گیا جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ اس مشن میں آٹھ ڈاکٹر۔ چھ ڈریسر اور تقریباً بارہ تیمار دار تھے۔ ٹرکی میں جاکر اس نے نہایت قیمتی خدمات انجام دیئے اور سینکڑوں مجروحین کی مرہم پٹی میں حصہ لیا ؞

دوسرا اہم کام اس مشن نے یہ کیا کہ اہل ہند کو تباہ حال ترکوں کے صحیح حالات

سے مطلع کیا جسکی وجہ سے چندہ کی ایک بڑی مقدار وہاں بھیجی گئی۔ زمیندار۔ ہمدرد اور الہلال نے ترکوں کی اعانت کے لئے فنڈ کھول دیئے جو لاکھوں تک پہنچ گئے ٭

ایک اور بڑا کام اس مشن نے یہ انجام دیا کہ ترکوں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک حد تک تعلقات پیدا کر دیئے اور نام نہاد پان اسلامزم کی تحریک کو ترقی دی۔ مشن چھ ماہ کے بعد واپس آیا۔ اور ترکوں کے دلوں پر مسلمانانِ ہند کی محبت کا نقش چھوڑ آیا۔ جو گذشتہ جنگ "عراق" تک باقی رہا ٭

واقعہ کانپور

مسٹر محمد علی کی زندگی میں کانپور کا واقعہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انکے مصائب کا راز اِسی پردے میں مستور تھے۔

۱۹۱۳ء میں کانپور کے مچھلی بازار میں ایک نئی سڑک بنانے کے لئے مسجد کے کچھ حصے کی ضرورت تھی۔ بعض متولیوں نے اس کے دے دینے پر رضامندی ظاہر کی جب شہر کے مسلمانوں کو معلوم ہوا تو وہ فراحسم ہوئے اور انہوں نے صاف صاف کہدیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا ٭

جب یہ مسئلہ میونسپلٹی میں پیش ہوا تو ممبروں نے مسجد کا کوئی ٹکڑا لینے کی مخالفت کی۔ مگر کلکٹر اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور اسنے مسلمانوں کی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اِس کے بعد مسلمانوں کا ایک وفد مسٹر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر کے پاس گیا اور اس سے

وردِ دل کا اظہار کیا گیا۔ مگر مسٹر جیمس نے مداخلت سے انکار کر دیا۔
اب کلکٹر مطلق العنان حاکم تھا اور اس نے ۲ جولائی کو فوجی پہرہ میں مسجد کا مجوزہ حصہ گرا دیا۔ اس خبر نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی اور خود کانپور کے رہنے والے تو مجنون و دیوانہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے تین اگست کو عید گاہ میں ایک زوردار جلسہ کیا اور اسمیں گورنمنٹ سے منہدمہ حصہ واپس دینے کا مطالبہ کیا۔
جلسے کے بعد کچھ مسلمان مسجد کیطرف چلے گئے اور مذہبی جوش و خروش میں گری ہوئی اینٹوں کو جمع کرنے لگے۔ اس پر پولیس نے مجمع کو منتشر کرنا چاہا۔ مگر جب مجمع منتشر نہیں ہوا تو مجسٹریٹ نے فائر کا حکم دیا جس سے پندرہ بیس آدمی مارے گئے اور بیسیوں زخمی ہوئے۔ فائر کے بعد گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ اور سو سے کچھ زیادہ افراد پکڑے گئے جن میں کچھ بچے بھی تھے۔
کلکٹر کا خیال تھا کہ اس طریق سے مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا ہو جائے گا۔ مگر یہ فائر مسلمانوں کے جذبات کو اور بھی زیادہ بھڑکانے کا سبب ہوا۔ تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے جلسے کئے اور کلکٹر کے اس طرز عمل پر تنفر کا اظہار کیا۔ شہدا کے پس ماندگان اور محبوسین کی اعانت کے لئے کثیر مقدار میں چندہ کیا گیا۔ وکیلوں اور بیرسٹروں کی ایک فوج ان کے مقدمے کی پیروی کے لئے آگئی مسٹر مظہر الحق سالار عسکر تھے۔
مسٹر محمد علی ابتدا میں بظاہر اس معاملہ سے الگ تھے۔ کیونکہ دوسرے اخبارات کی طرح کامریڈ اور ہمدرد میں تیز مضامین شائع نہیں ہوتے تھے۔ مگر فی الحقیقت وہ کسی

اور فکر میں تھے۔ وہ پرائیویٹ طور پر سر جیمس مسٹن سے خط وکتابت کر رہے تھے اور انہیں اس پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے تلافی کر دیں۔ مگر انکی یہ توقع بر نہیں آئی جب سر جیمس مسٹن نے لکھنؤ میں ڈیپوٹیشن کو مایوس کن جواب دیا تو مسٹر محمد علی بھی ان سے ناامید ہو گئے۔ اب انکے اخبارات اور وہ خود اس آجی ٹیشن میں پورا حصہ لے رہے تھے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں رہ کر کامیاب ہونا مشکل ہے تو وہ سید وزیر حسن کو لیکر انگلستان چلے گئے۔ تاکہ وہاں وزرا کو صحیح حالات سے مطلع کریں ؛

انگلستان پہنچ کر انہوں نے وزیر ہند اور وزیر انگلستان سے ملنا چاہا۔ مگر بد قسمتی سے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر انہیں انگلستان کی پبلک کو حقیقت حالات سے باخبر کرنا پڑا۔ اور ایک محدود حد تک انہوں نے اس فرض کو انجام دیا ؛

علاوہ ازیں وہ سر جیمس لاٹوش سابق لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ سے ملے سر لاٹوش اس وقت وزیر ہند کی کونسل کے ممبر تھے۔ وہ مسٹر محمد علی کے زوردار بیانات سے اسقدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے وزیر ہند کو اسطرف متوجہ کیا۔ اور سیکرٹری آف سٹیٹ نے لارڈ ہارڈنگ کی توجہ اس معاملے کیطرف مبذول فرمائی ؛

ہندوستان میں مسلمانوں میں روز بروز جوش وخروش بڑھتا جاتا تھا۔ اور تعزیری کارروائیوں کے باوجود ان کا رنج وغصہ گورنمنٹ کے لئے پریشان کن ہو رہا تھا۔ متعدد اسلامی اخباروں کی ضمانتوں کے باوجود انکی زوردار تحریریں حسب سابق مسلمانوں میں

اشتعال پیدا کر رہی تھیں۔ اور گورنمنٹ متشوش و مضطرب تھی۔
بالآخر لارڈ ہارڈنگ کی یادگار دانشمندی اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوئی۔ وہ اکتوبر میں خود کانپور آئے اور انہوں نے منہدمہ حصہ پر ایک چھت اور دالان بنانے کی اجازت دی اور نیچے کی زمین گزرگاہ کے لئے چھوڑ دی۔ نیز قیدیوں کو رہا کر دیا۔

یہ فیصلہ شرعی حیثیت سے قابل اعتراض تھا۔ مگر بعض علما وغیرہ کے تسلیم کرنے کی وجہ سے مسلمان عام طور پر مطمئن ہو گئے۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد مسٹر محمد علی نے کانپور کا معاینہ کیا اور لارڈ ہارڈنگ کو تبریک و تہنیت کا تار بھیجا جس پر وائسرائے نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

دھلی

کلکتہ میں مسٹر محمد علی مقامی معاملات میں کچھ حصہ نہیں لے سکے اور نہ ہی وہ اپنی ابتدائی اخباری مصروفیتوں کی وجہ سے ایسا کر سکتے تھے۔ مگر دہلی میں مقامی حیثیت سے انہوں نے بہت کچھ کام کیا۔ اور پبلک میں احساس و تحریک پیدا کرنے کی سعی بلیغ میں پیہم مصروف رہے۔ ان کے آنے سے پہلے دہلی کی سیاسی زندگی بالکل مردہ تھی اور سید سجاد حیدر کے زمانے کا رنگ بالکل محو ہو چکا تھا۔ مسٹر محمد علی کی آمد کے بعد اسمیں حیرت انگیز انقلاب ہوا اور اس کا قالب بے جان ایک مرتبہ پھر حیات تازہ سے روشناس

ہوگیا۔ ابتدا میں انہیں قصابوں کی ہڑتال میں مداخلت کرنی پڑی جو میونسپلٹی کے بعض
قیود عاید کرنے کیوجہ سے وقوع پذیر ہوگئی تھی۔ مسٹر محمد علی کی مساعی سے ان قیود پر
نظرثانی کی گئی۔ اور ان کے مشورے کے مطابق قصابوں نے ہڑتال بند کردی۔

شاہ جہان کی مشہور جامع مسجد میں ہزاروں نماز پڑھنے والوں کو موسم گرما میں
نہایت تکلیف ہوتی تھی۔ دوپہر کے وقت مسجد کا سنگ سُرخ اس قدر تپتا تھا۔ کہ
اسمیں سے آگ کے شرارے اور شعلے بلند ہوتے تھے اور چند لمحے بھی اس پر ٹھیرنا
مشکل ہوجاتا تھا۔ غریب نمازی بحالت جماعت اس جگہ کھڑے ہونے پر مجبور تھے
اس وقت ان کے پاؤں کے تلوے پتھر کی آگ سے اور ان کے سر تمازت آفتاب
کی وجہ سے یکسر شعلہ ہوکر انہیں اسی دنیا میں عذاب جہنم کا مزا چکھاتے تھے۔
بعض مفسرین صلواۃ کا مادہ صلّے تبلاتے ہیں جس کے معنے آگ جلانے کے ہیں
مقصود یہ تھا کہ نماز برائیوں اور گناہوں کو جلاتی ہے (ان الصلوۃ تنھیٰ عن الفحشا
والمنکر) مگر جامع مسجد میں تو برائیوں کی جگہ (منتظمین کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے) نماز
غریب نمازیوں کو جلاتی ہے۔ مسجد کے امام صاحب اور دیگر منتظمین مسجد اس سے
بے پرواہیں۔ کیونکہ انہیں علیحدہ ایک سقف پوش۔ سایہ دار اور پُر فضا مقام
حاصل ہے۔

مسٹر محمد علی نے بجا طور پر اس اشد شدید قساوت قلبی و سنگدلی کے خلاف
صدائے احتجاج بلند کی۔ انہوں نے ایک گرم و تپش آلود دن میں امام صاحب کو پکڑا

اور انہیں دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ اگرچہ اس وقت ان کے پاؤں میں سلیپر تھا۔ تاہم یقین ہے کہ مزاج وہاج درست ہوا ہوگا۔ مسٹر محمد علی کی کوششوں سے کسیقدر اصلاح ہو گئی۔ اور مسجد کی دونوں طرفوں میں سائبان لگائے جانے لگے۔

مسٹر محمد علی کی دوسری سعی، یہ تھی کہ مسجد میں وقتاً فوقتاً مذہب و سیاسیات پر لکچر دیئے جائیں۔ منتظمین مسجد اس کے خلاف تھے۔ مگر مسٹر محمد علی نماز جمعہ کے بعد کبھی کبھی لکچر دیا کرتے تھے۔

مسٹر محمد علی کی مساعی کیوجہ سے دہلی میں دو فریق ہو گئے۔ ایک خطاب یافتگان کا فریق تھا۔ جو اکثر اوقاف کا مالک بنا بیٹھا تھا اور گورنمنٹ کی اعانت اسے حاصل تھی دوسری طرف جمہور کا گروہ تھا۔ جس کے لیڈر مسٹر محمد علی تھے۔

پبلک مسٹر محمد علی کا نہایت احترام کرتی اور ان کے اشاروں پر چلتی۔ اگر کہیں انکے خلاف ذراسی صدا بلند ہوتی۔ تو عوام بھڑک اٹھتے تھے۔ سفر انگلستان کے زمانے میں جب بعض امرا و رؤسا نے مسٹر محمد علی کے خلاف کہنا چاہا تو عوام کے خوف سے کچھ نہ کہ سکے اور پھر اس پر بھی جو کچھ ان کا حشر ہوا وہ آج بھی سب کو یاد ہے۔ آخر خطاب یافتہ گروہ نے گورنمنٹ کے حضور میں اپنی بے بسی و بے چارگی کا بصد تضرع و زاری اظہار کیا۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ ان کی متواتر شکایات کو مسٹر محمد علی کی نظر بندی میں بہت زیادہ دخل تھا۔

پان اسلامزم (اتحادِ اسلامی)

رینان کہتا ہے کہ اسلام ایک غیر معمولی ولولہ انگیز قوت ہے۔ جو زبان، جنس، وطن، مزاج اور طبع کے اختلاف کے باوجود اپنے متبعین کو ایک کر دیتی ہے ❊

اسلامی دنیا کا مشہور و غیور مضمون نگار جلالی نوری بک لکھتا ہے کہ اسلامی قوموں میں اختلافِ جنسیت کا اثر نہیں۔ کیونکہ یورپ کی طرح اسلامی تعلیم میں نہ تو جنسیت کی بنیاد ہے نہ اثر ❊

اسلام کی ایک خصوصیت جلیلہ یہ ہے کہ وہ تمام دنیا کے لئے ایک عام ابرِ رحمت ہے جو ایشیا و افریقہ اور یورپ و امریکہ سب پر یکساں برستا ہے۔ وہ نہ تو بنی اسرائیل کے گھرانے کے لئے مخصوص ہے اور نہ ہی ہندوستان میں محدود رہتے ❊

اسنے قوم و ملک کے امتیاز کو اٹھا کر ایک عام رشتہ اسلامی پیدا کیا ہے جسمیں حضرت آدم علیہ السلام کا وسیع و عظیم الشان گھرانا منسلک ہوتا ہے۔ وہ ان نسلی و ملکی امتیازات کو آج سے تیرہ سو سال پہلے مٹا چکا ہے جنہیں فرانس کا مشہور فلسفی رچرڈ پال آج مٹانا چاہتا ہے ❊

شارع اسلام علیہ السلام نے ابتدا میں ہی مسلمانوں کو بتلا دیا تھا کہ مسلمانوں کی ایک ہی جماعت ہے۔ کیونکہ ان کا پروردگار بھی ایک ہے (ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون) مسلمان ایک جسم ہیں۔ اگر ایک حصۂ جسم ماؤف ہوتا ہے تو تمام بدن

متالم ہوتا ہے۔ (مثل المومنین مثل الجسد اذا اشتکی لہٗ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسہر والحمی) مسلمان بھائی بھائی ہیں (کل المومنون اخوۃ) یہی اتحاد و اصلاحی اور یہی پان اسلامزم تھا۔ جو آج سے تیرہ سو سال پہلے مسلمانوں میں قایم تھا۔

انیسویں صدی میں اہل فرنگ نے اسلامی ممالک کے تباہ و برباد کرنے کی جو مفسدانہ سازش کی تھی۔ اس کی وجہ سے تمام دنیائے اسلام میں بے چینی پھیل گئی حکیم الامت سید جمال الدین نے اس وقت سعی کی کہ مسلمانوں میں ایک مرتبہ پھر سیاسی اصلاح و اتحاد پیدا ہو۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ڈاکٹر عبد المامون سہروردی اور مسٹر مشیر حسین قدوائی وغیرہ کی کوششوں سے لنڈن میں پین اسلامک سوسایٹی بنائی گئی مسلمانوں کی اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ علے الخصوص ٹرکی اور علے العموم دیگر ممالک اسلامیہ کے متعلق ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ اور انہوں نے ان کی اعانت شروع کی ؛

یورپ اس سے غافل نہیں تھا۔ اسنے پہلے تو سید الاحرار کا اخبار عروۃ الوثقیٰ بند کر دیا۔ اور کوشش کی کہ مسلمانوں میں یہ تحریک اتحاد مٹ جائے۔ اس کے لئے اسنے یہ بیہودہ الزام تراشا کہ مسلمانانِ عالم ٹرکی کی سرکردگی میں یورپ کے خلاف ایک عام جہاد کرنا چاہتے ہیں۔ اور تمام دنیا میں اسلامی حکومت پھیلانے کے لئے شیخ سنوسی افریقہ میں۔ ٹرکی یورپ میں اور مسلمانانِ ہند و افغانستان ایشیا میں تیاریاں کر رہے ہیں۔ اسے صحرائے افریقہ میں ایک کروڑ چمکتی ہوئی تلواریں نظر آئیں۔ جو اس کے خون کی پیاسی

اور اس کے گوشت کی متلاشی تھیں۔ سے اناطولیا اور افغانستان کے مجاہدین صف در صف ہر گرد دکھلائی دیتے۔ جو اپنے خونخوار وخونفشاں نیزوں کے ساتھ یورپ کے میدان میں سرگرم جہاد وقتال ہونے والے تھے۔ انکی آنکھوں میں ہندوستان کی عظیم الشان اسلامی آبادی کھٹکتی تھی جو عنقریب فرنگستان کے خوبصورت شہروں کو غبار وگرد کی صورت میں بدلنے والی تھیں۔ اس کی عورتیں خوفناک مشرقی وحشیوں کے تصور سے کانپ اٹھتے تھے۔ اور اس کے بچے مہیب 'مسلمان' کے نام سے خوفزدہ ہو جاتے تھے ؛

اور یہ سب کچھ فریب سیاست کے سوا کچھ نہیں تھا اور اس کا مقصود اسلام اور اسلامی ممالک کی تباہی تھا۔ چنانچہ اس مفروضہ و موہومہ خطرے کی اشاعت کیساتھ مشہور متعصب وزیر انگلستان گلیڈسٹون امن عالم کے لئے قرآن حکیم کی تعلیم کے مٹانے کے درپے ہوا اور آسٹریلیا کے مشہور پروفیسر سکیسن ہارڈین نے کہا۔ کہ اسلام ایک خطرہ ہے اور اُسے مٹا دینا چاہیے ؛

یورپ کے اس الزام جہاد کے ساتھ ضعیف الایمان مسلمانوں کا عجب حال ہوا۔ اور وہ اس اتحاد اسلامی اور مقدس تعلیم جہاد سے کانوں پر انگلیاں رکھنے لگے۔ علی الخصوص فرقہ صدریہ علیگڈھ کا تو اس بارے میں عجب حال تھا۔ اور ایک دوسرے فرقے نے تو جہاد کی تعلیم کو منسوخ تبلا دیا تھا ؛

مولانا ابو الکلام آزاد کی طرح مسٹر محمد علی بھی اس اتحاد اسلامی کے اشد شدید

حامی ہیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ علے الاعلان کہا ہے کہ مسلمانوں کے جذبات وطن تک محدود نہیں بلکہ حسب احکام شرعیہ تمام مسلمانان عالم تک وسعت پذیر ہیں ۔

یورپ کی مخالفت کے علاوہ ایک اور دقت یہ تھی کہ اس مسئلہ اسلامی کیوجہ سے ہندو بھی متفکر تھے مسٹر پال نے اپنی کتاب قومیت و سلطنت میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔ گذشتہ جلسہ بنارس میں آنجہانی لوکمانیہ تلک۔ لالہ لاجپت رائے پنڈت مالویہ اور مولانا شوکت علی میں بھی اسپر تبادلۂ خیالات ہوا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ برادران وطن کے ساتھ یہ مسئلہ اتحاد کے مغایر نہیں اور یہ اس کا مقصود زیادہ سے زیادہ وہی ہے۔ جو آج مسئلہ خلافت میں نمایاں ہو رہا ہے۔ اور جسمیں خود ارباب وطن بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں ۔

مسٹر محمد علی کو اس عقیدے کیوجہ سے جو مصائب برداشت کرنے پڑے وہ سر ویلنٹائن چیرول اور مسز بسنٹ کے خطوط سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اول الذکر لنڈن ٹائمز میں لکھتا ہے "جرمنی کے ساتھ ٹرکی کے شریک جنگ ہونے پر پان اسلامزم کے حامیوں نے ہندوستان میں شورش برپا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس تحریک کے دو مشہور لیڈر مسٹر محمد علی اور شوکت علی نظر بند کئے گئے ۔

مسز بسنٹ تحریر کرتی ہیں "ٹرکی کے ساتھ مسٹر محمد علی کی بے انتہا مجہول ہمدردی کیوجہ سے گورنمنٹ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ علے الخصوص جبکہ روس کی تباہی نے مشرقی محاذ کمزور کر دیا ہے ۔"

ضبطی ضمانت

ترکوں کے جنگ یورپ میں شریک ہونے سے پہلے انگلستان کے نیم سرکاری اخبار لنڈن ٹائمز نے ترکوں کے لئے پسندیدہ روش کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس میں انہیں تنبیہ و تادیب کرتے ہوئے بتلایا۔ کہ ان کے لئے بہتر راستہ غیر جانبداری ہے۔ اور اگر انہوں نے اس سے انحراف کیا تو وہ تباہی کے غار میں گر پڑیں گے ؛

اس میں دلایل کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا۔ کہ بحالت جنگ ترک کن مشکلات و مصائب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اور انہیں نا ملایم و سخت الفاظ میں تجاوز حدود متعینہ سے روکا گیا تھا۔ مسٹر محمد علی اگرچہ ترکوں کی جنگ میں شرکت نہیں چاہتے تھے۔ مگر انہیں اس مضمون کا غیر مناسب لب و لہجہ اور بعض غلط اور گمراہ کن دلایل پسند نہیں آئے انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو اس کے جواب میں اڑتالیس ساعت کی مسلسل محنت سے ایک پر زور مدلل اور مسکت جواب لکھ کر ثابت کیا۔ کہ گذشتہ ایام میں انگلستان نے ترکوں کے خلاف کیا کچھ کیا۔ بخشہ وعدوں کی کس طرح صریح خلاف ورزی کی ترکوں کی تباہی میں کتنا حصہ لیا۔ اور پھر بتلایا کہ ترکوں کے شریک جنگ ہونیکی صورت میں برطانیہ کے لئے کیسے کچھ خدشات و خطرات ہیں۔ اور ان کے لئے بہتر راستہ کیا ہے ؛

آخر میں انہوں نے ترکوں سے کہا کہ ان کے لئے شریک جنگ نہ ہونا بہتر ہے

کیونکہ جنگ بہرحال نقصان بخش ہے۔ برطانیہ کو بتلایا کہ وہ ترکوں کی شرکت جنگ سے اپنے لئے شدید خطرات و مہالک کا سامان پیدا نہ کرے۔ بلکہ نرمی و رواداری سے انہیں اس سے منع کرے۔ اور تالیف قلوب کے لئے حسب وعدہ انہیں مصر واپس کردے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیا۔ کہ وہ ہرحال میں امن قایم رکھنے کی کوشش کریں ؛

اِس مضمون کے چار روز بعد ٹرکی نے اعلانِ جنگ کیا۔ مسٹر محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے ہز ایکسلنسی طلعت بے کو اِس سے پیشتر ایک تار بھیجا تھا جسمیں تحریر تھا کہ موجودہ حالات پر نظر غائر ڈالنے کے بعد ہم اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ ترکوں کی شرکت جنگ ٹرکی اور مسلمانانِ عالم کے لئے تباہ کن ہوگی۔ ہم آپ سے بزور درخواست کرتے ہیں۔ کہ شرکت جنگ سے پہلے سو مرتبہ غور کریں۔ لڑائی کی صورت میں ہماری حالت بہت نازک ہوگی۔ اِس کے بعد جب ترکوں کے اِعلان جنگ کا تار پہنچا۔ تو مسٹر محمد علی انتہائی رنج و مایوسی سے مضطرب ہوگئے اور آیندہ کے خطرات کیوجہ سے ان کا دِل دردمند فغاں سنج اور انکی آنکھیں اشکبار تھیں ؛

کامریڈ میں مذکورہ مضمون شایع ہونے کے تقریباً ایک ماہ بعد کامریڈ پریس کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کی گئی۔ اور گو سٹر اینڈ ریو نا اور بعض اخبارات نے اِس مضمون کے حسن استدلال۔ زور بیان اور اظہار صداقت کی تعریف کی ہے۔ مگر گورنمنٹ کو اسمیں برائی کے سوا کچھ اچھائی نظر نہیں آئی ؛

نظر بندی

ضبطی ضمانت کے بعد غریب اڈیٹر نظر بند کیا جاتا ہے۔ اور مسٹر محمد علی بھی پندرہ مئی ۱۹۱۵ء کو اسی دستور قدیم و مشہور کے مطابق نظر بند کئے گئے۔ اس سے بیشتر جب وہ امپہ گئے۔ تو ریاست کیطرف سے انہیں وہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا گرچند ہفتوں کے وہ خرابی صحت کیوجہ سے منصوری جانے پر مجبور ہو گئے اور بمشکل تمام انہیں ریاست کیطرف سے اجازت ملی۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شوکت علی کے ہمراہ دہلی آئے۔ جہاں چیف کمشنر نے انہیں نظر بندی کے احکام سے مطلع کیا جن کے رو سے مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی قصبہ مہرولی کے حدود سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔

جس روز یہ دونو بھائی دہلی سے مہرولی گئے۔ یہ جمعہ کا روز اور دوپہر کا وقت تھا دہلی کی عظیم الشان جامع مسجد میں ہزاروں اشخاص اپنے عزیز و محبوب لیڈروں کو رخصت کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور جب وہ نماز ادا کرنے کے بعد آمادہ روانگی ہوئے تو یہ مجمع عظیم پیکر رنج و غم اور تصویر حسرت و یاس تھا۔ سینکڑوں اشخاص شدت درد و غم سے اشک افشاں اور محو نالہ و فغاں تھے۔ بیسیوں دیوانہ وار ان سے لپٹ لپٹ کر اپنے کرب و بے چینی کا اظہار کرتے تھے۔ موسم کی تپش حکام وقت کیطرح قہر و غضب کی آتش باری سے غافل نہیں تھی۔ مگر یہ مجمع عشاق اپنی محویت و

بے خودی گیو جہ سے اس سے بے پرواہ تھا۔ بمشکل تمام چند ساعت کے بعد دونو بھائی موٹر میں بیٹھ سکے۔ اور جب وہ چلنے لگی تو سینکڑوں آدمی اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اور بڑی ہی مشکل سے کچھ سمجھانے بجھانے سے اس مجنونانہ حرکت سے باز آئے ؛

مسٹر محمد علی کی نظر بندی کی خبر سے۔ تمام ہندوستان کے مسلمان مضطرب ہو گئے اور اظہار رنج وغصہ کے لئے سینکڑوں جلسے کرنیکے علاوہ ہزاروں تار گورنمنٹ کو بھیجے گئے۔ مگر وہاں سے کچھ جواب نہیں آیا ؛

مسٹر مظہر الحق، مسٹر جناح اور راجہ محمود آباد نے کونسل میں بھی انکی رہائی کے لئے کوشش کی۔ مگر بار آور نہیں ہوئے ؛

مسز بسنٹ نے وایسرائے سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ ان بھائیوں کو رہا کر دیں۔ جواب ملا کہ انکی رہائی مخدوش ہے ؛

دونو بھائی مہرولی سے لینس ڈاؤن (یوپی) اور وہاں سے چھندواڑہ (سنٹرل پراونس) بھیجے گئے۔ آخر الذکر مقام پر وہ کئی سال تک نظر بند رہے۔

جب مہاتما گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیا گرہ تحریک شروع کی تو یہ دونو بھائی اسمیں شریک ہو گئے۔ اور انہوں نے گورنمنٹ پر حکم نظر بندی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

اسی زمانے میں جنگ افغانستان شروع ہو گئی۔ اور گورنمنٹ کو ان پر گورنمنٹ

افغانستان کی ہمدردی و اعانت کا شبہ ہوا اسلئے اُسنے انہیں جیل میں قید کر دیا کچھ عرصہ بعد وہ بیتول کے جیل بھیج گئے جہاں ایک مدت تک وہ قید رہے۔

جرم

ایک دلچسپ اور اہم بحث یہ ہے کہ مسٹر محمد علی کیوں نظربند کئے گئے۔ گورنمنٹ سے جب کبھی پوچھا گیا تو یا تو اسنے جواب ہی نہیں دیا۔ یا اس کا جواب یہ تھا کہ محمد علی کا وجود ہی جرم ہے۔

وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب

دو سال کے بعد جب مسز بسنٹ نظربند ہوئیں اور تمام ہندوستان میں انکی اور مسٹر محمد علی شوکت علی کی رہائی کیلئے آئینی شورش پھیل گئی تو گورنمنٹ نے مسز بسنٹ کو رہا کر دیا اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولیس کو حکم بھیجا کہ وہ ان دونوں بھائیوں سے ایک تحریری معاہدہ پر دستخط حاصل کرے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ محترمہ کے ارشاد کے مطابق انہیں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ہم اسلامی حدود کے اندر رہکر ان شرائط کو منظور کرتے ہیں۔ اس اضافے نے گورنمنٹ کو آتش بر پا کر دیا اور اسنے انہیں بدستور نظربند رکھا۔ گویا ان کا سب سے بڑا جرم ان کا مسلمان ہونا ہے۔

اب یہ کہتا ہے وہ کافر کہ مسلمان ہے تو

یہاں اسکی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل سے اس موضوع پر بحث کریں۔ ایک کثیر مواد پر نظر ڈالتے ہوئے جو اس معاملہ پر روشنی ڈال سکتا ہے ہم مفصلہ ذیل نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں۔

(۱) معاملہ کا نیتجہ یہ ہے مسٹر محمد علی اور مسٹر جیمس مسٹن میں شدید اختلاف ہو گیا۔ مسٹر جیمس کیساتھ ہی انسپکٹر جنرل پولیس صوبجات متحدہ بھی مسٹر محمد علی کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی سعی سے مسٹر محمد علی رامپور میں نظربند کئے گئے۔

(۲) دہلی میں مقامی معاملات میں دخیل ہونے اور خصوصاً جامع مسجد کی اصلاح کی سعی کرنیکی وجہ سے دہلی کے خطاب یافتگان اصحاب کے اشد شدید دشمن ہو گئے اور انہوں نے اپنے پیہم کوشش و گذارش سے گورنمنٹ کو اسطرف متوجہ کیا ۔

(۳) سر چارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل محکمہ خفیہ پولیس نے مسٹر محمد علی سے خواہش کی کہ لارڈ ہارڈنگ کے خلاف سازش میں شریک ہو جائیں اور جو کچھ مراعات اور رواداری کا رویہ ہندوستانیوں سے برت رہے ہیں اسے مٹانیکی کوشش کریں۔ مسٹر محمد علی نے اس سے قطعی انکار کیا جس پر کلیولینڈ ان کا مخالف ہو گیا۔ اور اسنے محمد علی کے خلاف جعلی دستاویزیں بہم پہنچا کر گورنمنٹ اور انڈیا کو ان سے منحرف کیا ۔

(۴) ان دستاویزوں میں دو خطوط ہیں جو کہا جاتا ہے کہ دونوں بھائیوں نے امیر افغانستان اور مولانا عبد الماری کو لکھے۔ پہلے خط میں امیر صاحب کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ دوسرا خط جہاد پر مشتمل تھا ۔

دونوں بھائیوں کی نظر بندی کے سلسلہ میں ایک اور خط بھی ہے۔ جو دہلی کے ایک مشہور بیرسٹر نے سی۔ آئی ڈی کی رپورٹ کے طریق پر گورنمنٹ کو بھیجا اور اسے بتلایا کہ دونوں بھائی گورنمنٹ کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ لارڈ ہارڈنگ نے راجہ صاحب محمود آباد کو یہ خط دکھلایا تھا ۔

مگر یہ تینوں خطوط قطعی طور پر جعلی ہیں۔ پہلے دو خطوط کی تصنیف کے متعلق دونوں بھائیوں نے قطعی انکار کر دیا اور گورنمنٹ کیلئے خاموشی کے سوا چارہ نہیں تھا تیسرا خط بھی بیرسٹر موصوف کے بیان کے مطابق جعلی ہے۔

(۵) مسٹر محمد علی کا مشہور آرٹیکل ترکوں کا انتخاب بھی ان کی نظر بندی میں بہت کچھ دخل رکھتا ہے۔

(۶) دونوں بھائیوں نے جس ثبات و استقلال سے اس نظر بندی کے مصائب کو برداشت کیا

اور جس طرح ہمیشہ انہوں نے اخوت اسلامی کیوجہ سے اس حالت میں بھی ترکوں کیساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔

(۱) کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنگ کی مخدوش حالت میں گورنمنٹ انہیں چھوڑ نہیں سکتی تھی ٭

(۲) ہیاگرہ کی تحریک میں عزم شرکت اور جنگ افغانستان کیوجہ سے گورنمنٹ نے انہیں مقید کر دیا۔

رہائی

جس غیر معمولی صبر و استقلال سے ان بھائیوں نے ایام قید و نظر بندی بسر کئے اور جسطرح گوناگون شدائد و مشکلات کے باوجود ان مجاہدین حق و صداقت نے اہانت پرستی و اسلام دوستی میں لذائذ و نعائم کی جگہ خطرات و مہالک کو ترجیح دی اس کے نظایر و امثال ہندوستان کی تاریخ جدید میں بہت کم میسر آئیں گے عام طور پر مسلمانان ہند انکی اس طویل قید کیوجہ سے انکی رہائی سے مایوس ہو چکے تھے۔ خصوصاً جنگ کے اختتام پر بھی ان کا بدستور قید رہنا بہت سے دلوں کو مایوس کر چکا تھا اور خود ان دونوں بھائیوں کو کسی طرح رہائی سے چھوٹنے کی توقع نہیں تھی اور سچ پوچھئے تو وہ اس مقدس جرم اسلام و حریت میں زندان عقوبت کے سوا کسی اور چیز کے طلبگار تھے ٭

در مدرسہ کس نہ رسد دعوائے توحید　　منزل گہ مردان موحد سر دار ست

مگر ۱۹۱۹ء کے اخیر میں اعلان شاہی کے شائع ہونے پر وہ بھی ساڑھے چار سال کی قید و نظر بندی کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ انکی رہائی پر ملک میں واقعہ پنجاب و مسئلہ خلافت کی تشویش و اضطراب کے باوجود جس قدر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا۔ اور امرتسر۔ لاہور۔ دہلی۔ بمبئی وغیرہ مقامات میں ان کا جو عظیم الشان اور جلیل القدر استقبال کیا گیا۔ وہ انکی محبوبیت و ہر دلعزیزی کا صحیح معیار بتلا سکتا ہے۔ دہلی میں ساعت خانہ (گھنٹہ گھر) سے بیکر بانسوں کی دیواروں تک ایک وسیع و عظیم سٹیج تیار کیا گیا اور اسے مختلف اقسام کے

نفیس و خوشنما ساز و سامان بھیجا گیا پھر نقرئی کشتوں میں پچاس ساٹھ ہزار کے مجمع نے انکی خدمت میں ایڈریس پیش کیا اور ان سلاطین قلوب و اذہان ملوک جذبات و امیال کے حضور میں اشرفیاں نذر گزرانی گئیں لاہور میں مردوں کے علاوہ صدہا عورتیں بھی انکے جلوس میں شریک تھیں اور تمام بڑے بڑے بازار انکے استقبال میں غیر معمولی زینت و آرائش سے عروس نو بنادیئے گئے تھے۔ امرتسر میں کانگریس کیوجہ سے نہایت جوش و خروش اور شوق و ولولہ تھا۔ مہاتما گاندھی۔ لوکمانیہ تلک۔ پنڈت نہرو۔ حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر کچلو وغیرہ متعدد لیڈروں کا استقبال کیا گیا پھر بھی جو شاندار استقبال ان دو بھائیوں کو وہاں میسر آیا۔ وہ کسی حیثیت سے دوسروں سے کم نہ تھا۔ علاوہ ازیں تمام ملک نے انکی خدمت میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ نذرانہ کے طور پر پیش کیا جسے انہوں نے قبول کر کے خلافت فنڈ میں دے دیا۔

نیز فرنگی محل لکھنؤ کے دار العلوم نظامیہ نے دونوں بھائیوں کی خدمت میں مولانا کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ اس وقت سے ملک انہیں مولانا کے خطاب سے یاد کرتی ہے اور گذشتہ کانگریس میں تو بیچارے مسٹر جناح اپنے ہم نام (محمد علی) کو مولانا نہ کہنے کی وجہ سے معتوب و مطعون خلائق بھی ہوئے۔ اسمیں شک نہیں کہ انگریزی حلقے انکی سیاسی و انگریزی قابلیت کیوجہ سے انہیں مسٹر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ اور مولانا کا القاب جدید عوام کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ مگر ہمارا عشق لطیف و نازک اب تو مسٹر اور مولانا دونوں کے بار گراں کا متحمل نہیں ہے۔ اور صرف محمد علی کا محبوب و عزیز نام ورد زبان و وظیفہ حیات بنا سکتا ہے۔ خود محمد علی بھی اپنی انتہائی سادگی و آزادگی کی وجہ سے جناب اکبر کی زبان میں یوں گویائے حقیقت ہو سکتے ہیں۔

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

تحریکِ خلافت وسفر انگلستان

مولانا محمد علی ابھی زندانِ مقدس و معطوب ہیں عزم و ثبات کے ساتھ جہادِ حریت کی تلقین کر رہے تھے کہ مسلمانانِ ہند میں مسئلہ خلافت کی وجہ سے غیر معمولی اضطراب پھیل گیا۔ حکومت برطانیہ نے مقاماتِ مقدسہ۔ عراق و عرب پر یا تو قبضہ کر لیا تھا یا انہیں اپنے حلقہ اثر و نفوذ میں شامل کر لیا تھا نیز جزیرۃ العرب کے ایک بڑے حصے پر قابض ہونے کے علاوہ خلیفۃ المسلمین کو بیکار و معطل کر دیا تھا۔ یہ تمام امور شریعت اسلامیہ کے احکام صریحہ کے خلاف تھے اور ان حالات میں مسلمانوں پر جہاد فرض تھا۔ مولانا عبد الباری نے وقتاً فوقتاً اس حقیقت کا اعلان کیا تھا۔ مسٹر یعقوب حسن نے مدراس کی کونسل میں گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی تھی اور بمبئی میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسے میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا۔ مسلمانوں کی خوش بختی سے مہاتما گاندھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کی غیر معمولی اعانت و امداد سے یہ تحریک فروغ پذیر ہوئی ؎

اسی عرصہ میں مولانا محمد علی اپنے برادر معظم کے ساتھ رہا ہوتے اور رامپور سے ہو کر امرتسر گئے۔ جہاں کانگریس اور لیگ کے علاوہ خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی تھا انہوں نے دیکھا کہ مسئلہ خلافت اخوت اسلامی کے لئے حرارت دینی و صداقت جانفروشی کے ساتھ وہ حلقہ زنجیر و رسن رہ چلے تھے۔ وہ آج پورے جوش سے ہر برادر ملت کے قلب مطہر میں ہزاروں آب و تاب سے جلوہ آرا ہے۔ گویا انکی طویل قید و نظر بندی کا یہی انعام تھا جو اس آزمائش و ابتلائے شدید کے بعد انہیں حاصل ہوا۔

وہ اپنے بھائی کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ جو تحریک گز دس کی رفتار سے بڑھ رہی تھی وہ اب فرلانگ اور میل کے نشانات سے بے پرواہ تھیں ؎

اسی عرصہ میں مجلس خلافت نے محسوس کیا کہ اس مسئلہ کا صاف و صریح اسلامی پہلو اہل برطانیہ کو بتلانے

کے لئے ایک ڈیپوٹیشن کا انگلستان جانا بہت ضروری ہے چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا کی رضامندی سے ایک وفد بھیجا گیا
جس کے سرکردہ مولانا محمد علی تھے۔ انکے علاوہ مولانا سید سلیمان اور مسٹر سید حسین اس وفد میں شریک تھے۔
مسٹر حیات اس وفد کے سیکرٹری تھے ڈیپوٹیشن نے انگلستان پہنچکر مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم اور مسٹر فشر
قایم مقام وزیر ہند سے ملاقات کی اور انھیں نہایت صاف طریق پر بتلایا کہ وہ ممالک اسلامیہ عرب و شام و عراق و
ٹرکی کا فیصلہ حسب شریعت اسلامیہ کریں وگرنہ مسلمانوں کے لئے جہاد و ہجرت کے سوا چارہ کار نہیں ہوگا
اور سلطنت برطانوی مشرق میں متزلزل ہو جائیگی۔ وزراء سے ملنے کے علاوہ انھوں نے مختلف تقریروں اور
تحریروں کے ذریعے سے اہل برطانیہ کو مسئلہ کی اہمیت و نزاکت سے مطلع کیا نیز اٹلی اور فرانس میں بھی مختلف
تقریریں کیں۔ ان تمام کوششوں کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اٹلی اور فرانس تو مسلمانوں کے جذبات
کے موافق معاہدہ ٹرکی میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر برطانیہ حق پسند برطانیہ اسلام دوست اور مسلم
نواز برطانیہ اپنی دس کروڑ مسلمان رعایا کی پیہم التجاؤں اور گذارشوں کے باوجود اس پر آمادہ نہیں
ہے۔ اس پر وہ یہ کہتے ہوئے واپس آگئے ۔

کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

تحریک ترک موالات اور علیگڈھ کالج

انگلستان سے واپس آنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات زور شور سے جاری ہے جسے
مہاتما جی نے بعض علمائے اسلام کے مشورہ سے جاری فرمایا تھا اور کلکتہ کی کانگریس میں کامیاب ہونیکی وجہ سے
ملک کی اکثر کار فرما جماعتوں نے اس پر عمل پیرائی شروع کردی تھی ۔

یہ تحریک بظاہر پورے طور پر کامیاب تھی۔ مگر مولانا محمد علی کی دور بین و حقیقت شناس نظروں نے معلوم کیا کہ ظاہری کامیابیوں کے باوجود اس کی بنیادیں پختہ و استوار نہیں ہیں اور اسکی وجہ گذشتہ کانگریس کے اختلافات کیوجہ سے قوم پرستوں کی عملاً علیحدگی ہے۔ اسلئے انہوں نے ارادہ کیا کہ آیندہ اجلاس ناگپور میں وہ اس نقص کو رفع کرنیکی سعی کریں گے۔ انگلستان کی واپسی کے بعد ان کا پہلا وار علیگڈھ کالج پر ہوا۔ انہوں نے علیگڈھ کے طلبا میں ترک موالات کی روح پھونک دی اور ان سے مطالبہ کرایا کہ یونیورسٹی سے الحاق قطع کیا جائے۔

ارباب کار نے اس مشورہ کو تسلیم نہیں کیا اور طلبا نے سٹرائیک کر دی۔ پھر مولانا محمد علی نے بحیثیت ٹرسٹی کوشش کی کہ ٹرسٹیوں کا گروہ حکومت وقت کا طوق گرانبار گردن سے اتار ڈالے مگر اسمیں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اسی عرصہ میں انہوں نے طلبا کے ساتھ کالج میں رہائش اختیار کی۔ بدقسمتی سے کالج کے منتظمین مسلمانان ہند کے اس سب سے بڑے لیڈر سے اتنے سلوک و مدارا سے بھی پیش نہیں آئے جس کی ایک عام آدمی بھی توقع کر سکتا ہے۔

انہوں نے پانی وغیرہ ضروریات حیات کے بند کرنے کی کوشش کی طلبا اور اس محترم لیڈر کو کالج کے احاطہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور بالآخر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بلوا کر انہیں وہاں سے نکال کر چھوڑا۔ شاید وہ اپنی اس کامیابی پر نازاں ہوں۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس ان کی اس کاروائی کے لئے نفرت اور غصے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اسلامی اخلاق کی ادنےٰ سی شان کی نمائش بھی نہیں کر سکے اور پھر اپنے اس فعل شنیع و عمل قبیح پر نازاں ہیں۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مولانا محمد علی کے لئے اب اسکے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ ایک مستقل آزاد دار العلوم قایم کریں چنانچہ انہوں نے ایک جدید آزاد یونیورسٹی قایم کر دی جس کا صدر مقام علیگڈھ قرار دیا۔ خود مولانا محمد علی اس جدید انسٹی ٹیوشن کے پرنسپل ہیں مولانا

ابوالکلام صدر مدرس صیغہ دینیات ہیں اور بعض اور قابل قدر ہستیاں اس میں کام کر رہی ہیں۔ علیگڈھ کالج اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا کی ایک کثیر تعداد اسمیں شریک درس اور محو تعلیم آزادی ہیں۔

اگرچہ اس جدید یونیورسٹی کے قیام میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم۔ مولانا آزاد۔ مولانا شوکت علی۔ مہاتما گاندھی۔ ڈاکٹر انصاری۔ حکیم اجمل خاں وغیرہ اصحاب کو بھی دخل ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس کے قیام و اہتمام کا سہرا مولانا محمد علی کے سر پر رہتا ہے۔

قیام علیگڈھ کے بعد بزرگان علیگڈھ علی الخصوص ان کے ہمنام سیکرٹری نے انہیں بدنام اور گورنمنٹ کو مشتعل کرنے کی بے حد کوشش کی۔ مگر انہیں ان دونوں کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ پہلی کوشش کا نتیجہ تو بجائے سیکرٹری کی اپنی بدنامی پر ختم ہوا۔ دوسری کوشش کو مہاتما جی کے اس اعلان نے بے اثر کر دیا۔ کہ زبان یا سفر کی پابندی پردہ اور علی برادران مقاومت مجہول پر مجبور ہونگے۔

علیگڈھ کے ارباب حل و عقد نے اپنی اس ناکامی کو یونیورسٹی کے پردے میں چھپانا چاہا۔ انہوں نے جھٹ کوشش کر کرا یونیورسٹی حاصل کر لی اور مولانا محمد علی کے عشوہ طراز دوست راجہ محمود آباد کو شریک حال کر لیا۔

دسمبر کے اخیر تک محمد علی آزاد مسلم یونیورسٹی کے اہتمام میں مصروف رہے۔ دسمبر کے اخیر میں وہ ناگپور کی کانگریس میں شریک ہوئے اور انکی مساعی جمیلہ سے مہاتما گاندھی کے طرفداروں اور قوم پرستوں میں اتحاد ہو گیا۔ اس اتحاد میں طے ہوا کہ ترک موالات کے وسیلہ سے جلد از جلد سوراج حاصل کیا جائے اور اس طرح مسایل خلافت و پنجاب کا حل کیا جائے۔ ناگپور کی کانگریس کے بعد وہ مہاتما گاندھی جی کے ساتھ بنگال کا دورہ کرتے رہے اور اب علیگڈھ کالج میں تعلیم و تبلیغ کے فرایض انجام دے رہے ہیں۔ مجسٹریٹ ضلع علی گڈھ نے انہیں عام جلسوں میں تقریر کرنیکی ممانعت کر دی ہے اور وہ اس جایز حکم کی درازدستی کو عنقریب خنجر زبان سے قطع کرنے والے ہیں۔

مطالعہ کردہ شد
احقر محمد عبدالکریم چشتی عفی عنہ
Scanned with CamScanner